سر سید احمد خان اور تحریک آزادی

(Sir Syed Ahmad Khan & the Freedom Movement)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2022.06041833

محمد طارق

Muhammad Tariq
Associate Professor, Department of Urdu
Govt. M.A.O College, Lahore

Abstract:

In the War of Independence (۱۸۵۷), Bahadur Shah Zafar`s defeat and the British's victory had averted the entire scenario of sub-continent. As a result, the rulers became slaves who were striving hard to secure their lives. The condition of their subject was same as well. The Muslims of sub-continent faced every type of torture and injustice. They were thrown to the jails; scaffolds were made ready to hang them out. Their families were suffering from financial crunch and the worst circumstances. It seemed the end of life for them as they were depressed and in a state of mind. In these dejected circumstances, Sir Syed Ahmad Khan emerged as a saviour of the nation. He strived for educating people and teaching them how to face the challenges of the world. He stood stalwart in front of the British for the rights of his nation. This article throws light on the services of Sir Syed Ahmad Khan in the perspective of Freedom Movement.

Keywords:

Sir Syed Ahmad Khan, Bahadur Shah Zafar, Freedom Movement, Muslims of Sub-continent, Independence War ۱۸۵۷, Sir Syed's Reforms, Sir Syed as Saviour of the Nation.

مقالہ "سر سید احمد خان اور تحریک آزادی" کو تین زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ وجوہات، اثرات اور نتائج۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ سر سید ایک بنیاد کا نام ہے۔ تحریک ادبی ہو یا سیاسی، سر سید کے بغیر نامکمل ہے۔ ادب میں علی گڑھ تحریک سے شروع ہونے والا سفر رُومانوی، ترقی پسند، حلقہ ارباب ذوق، علامت نگاری سے ہوتا ہوا جدیدیت پر آ کر ٹھہر سا گیا۔ یہ سب تحاریک ایک دوسری کے رد عمل کے طور پر ظاہر ہوئیں لیکن ان سب تحاریک کی بنیاد سر سید نے فراہم کی۔ علی گڑھ کی تحریک مقصدیت پر مبنی اصلاحی تحریک تھی۔ یہ نکتہ بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ سر سید کی ہر

تحریک کسی نہ کسی مقصد کے تحت تھی چاہے وہ ادبی ہو یا سیاسی۔ سرسید اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ ادب میں ہیں تو سب کی توجہ کا مرکز ہیں۔ لوگ ان کی تحریروں کا انتظار کرتے اور جب وہ سیاست کے منظر نامے پر اُبھر کر سامنے آئے تو وہاں بھی ان کے پیشِ نظر مسلمانوں کی فلاح و بہبود ہی تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگام میں مسلمانوں کی حالت بہت پتلی تھی۔ ایک ایسی قوم جس کی کوئی سمت ہی متعین نہیں تھی۔ کسی لیڈر کے بغیر حکمرانوں کے ظلم و ستم کا شکار۔ ایسے میں ایک مردِ میدان قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھائے سیاست کے کارزار میں نمودار ہوا۔ گو کہ اس وقت مسلمانوں کے حق میں بات کرنا اپنی جان گنوانے کے مترادف تھا۔ اس کی ایک جھلک "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" (۱۸۵۹ء) کی اشاعت کے وقت کچھ اس طرح بھی نظر آتی ہے جب سرسید کے اپنے رفقائے کار نے انھیں اس کی اشاعت سے روکنے کی ایک ناکام کوشش کی۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> "۱۸۵۹ء میں اس کی پانچ سو جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔ جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو۔"(۱)

یہاں سرسید کے جواب سے اُن کے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اِخلاص کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو سرسید کا جواب:

> "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں، پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔"(۲)

وہ شخص جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ وہ شخص جس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر خطرات مول لیے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں انگریزوں نے مسلمانوں کو چُن چُن کر سزائیں دیں، جیلیں مسلمانوں سے بھر دی گئیں۔ پھانسی گھاٹ تیار کیے گئے۔ مسلمان گھرانے معاشی بدحالی اور ابتر طرزِ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں ہندو بھی انگریزوں کی ہمدردی میں اپنے بدلے گِن گِن کر لے رہے تھے اور اپنے بُغض و عناد کے تیر چلانے میں کسی طرح بھی پیٹھے نہیں تھے۔ اس کی ایک جھلک ہمیں مئی ۱۸۵۷ء سے اپریل ۱۸۵۸ء تک بجنور کے حالات میں کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے:

> " وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے جب مراد آباد میں پہنچے تو ان

کی تباہی و بربادی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ ان کی نظر سے گزرا جس سے ایک چوٹ ان کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غصہ خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندو خیر خواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے رہے تھے۔"(۳)

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی ایک تصویر ہمیں کچھ یوں بھی ملتی ہے جب سرسید دہلی میں اپنی والدہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے پہنچے تو اُس نے اِن سے کہا:

"تم یہاں کیوں آئے ہو، یہاں تو سب کو قتل کیا جارہا ہے۔ تم بھی مارے جاؤ گے۔ ہم پانچ دن سے گھوڑوں کے دانہ پر گزارہ کر رہے ہیں۔ تین دن سے پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ تمہارے چچا اور چچازاد بھائی قتل کر دیے گئے ہیں۔"(۴)

یہ الفاظ اُس خاندان کے ہیں جو انگریزوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ حالات کسی طرح بھی قابل قبول نہ تھے لیکن ان کے لیے ان حالات سے چھٹکارہ پانے کی کوئی سبیل اور کوئی تدبیر بھی کارگر ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اگر ہم ان حالات کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں دو چیزیں واضح نظر آتی ہیں ایک بے بسی اور دوسری بے حسی۔ بے بسی مسلمانوں کا مقدر ٹھہری اور بے حسی اُس وقت کے حکمرانوں کا خاصّا ہوئی۔ مسلمان ہونا ہی ایک جرم بن گیا تھا۔ حالیؔ اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا۔ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔"(۵)

میں یہاں تھوڑی دیر کے لیے روک کر آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ سرزمین ہندوستان کی مٹی ہی کچھ ایسی خاصیت رکھتی ہے کہ جہاں مسلمانوں پر ہر عہد میں ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور ہندو اپنی مکاری کے سبب اس ظلم و جبر کا کسی نہ کسی شکل میں حصہ دار رہے۔ آج بھی اسی نظریے کی بنا پر ہندوستان میں مسلمانوں پر زمین تنگ کر دی گئی ہے اور ان پر گاہے بگاہے تشدد کے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس نازک دور میں جب مسلمان کسی رہنما کی تلاش میں تھے، وہ دَور جس میں خیالات کے اِظہار پر قدغن ہو، مارشل لاء کا دور دورہ ہو، نفسا نفسی کا عالم ہو، شک اور شبے کے ترازو میں لوگ ایک دوسرے کو تولتے ہوں، ایک دوسرے پر اِعتبار کے زاویے بدل کر رہ گئے ہوں، معاشی بدحالی سے مسلمان گھرانے فاقوں پر مجبور ہوں اور پھر کارِ سرکار کی حالت یہ ہو کہ انھیں ان کی بے چارگی اور بے بسی پر ذرہ برابر بھی رحم نہ آئے اور انھیں اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو کہ مسلمانوں کی حالت زار کو کس طرح سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس گورنمنٹ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ رہی ہو جو کبھی بھولے سے بھی مسلمانوں سے ربط ضبط رکھتے ہوں تاکہ وہ سزاوار ٹھہرائے جا سکیں۔ ان حالات میں سرسید کا میدان میں اترنا اور انگریز سرکار کو زمینی حقائق سے رُوشناس کرانا، جان

ہتھیلی پر رکھنے کے مترادف تھا۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

"اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور ان کی تالیف کرنی یعنی ان کے دلوں کو ہاتھ میں رکھنا بہت بڑا سبب ہے پائیداری ء گورنمنٹ کا۔ تھوڑا ملے اور آدمی کی عزت ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ بہت ملے اور تھوڑی عزت ہو، بے عزتی کرنی کسی کی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دُکھاتی ہے۔ یہی چیز ہے کہ بغیر ظاہری نقصان پہنچائے عداوت پیدا کرتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا۔"(۶)

یہاں سرسید نے انتہائی جرات اور دلیری سے انگریز سرکار کو نہایت عمدہ طریقے سے ایک طرف تو ان کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی عزت نفس کو بحال کرنے کی ترغیب دی ہے۔ تیسرا حکمرانوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ مسلمانوں اور ان کے درمیان جو خلیج ہے اسے کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ سرسید کو ہندوستانیوں کی بے توقیری کا شدت سے احساس ہے جو انگریز سرکار نے ان سے رویہ اپنایا، وہ قطعی طور پر قابل قبول نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سرسید ایک اور جگہ کچھ اس طرح اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"بے شک ہمارے گورنمنٹ ان باتوں کو بھول گئے۔ بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہمارے گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقت کر دیا ہے۔"(۷)

بلاشبہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی جسے انگریز غدر پر محمول کرتا ہے، کے اثرات نہایت گھمبیر اور دیرپا تھے۔ مسلمان گھرانے بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ ایسے میں سرسید ہی وہ واحد مرد میدان تھے جنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سیاسی میدان میں جہاں انھوں نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کے ذریعے برطانیہ کے حکمرانوں تک ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی کی وہیں تعلیمی اصلاحات کا ذمہ بھی انتہائی فرض شناسی سے انجام دیا۔ اس کے لیے انھوں نے ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا دورہ کیا اور پھر وہاں سے واپس آکر ۱۸۷۰ء میں ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ سکول کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور پھر ۷۸۔۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج کا قیام مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے اپنے قدم جمانے کی طرف سرسید کا ایک نہایت احسن اقدام تھا۔ یہاں ہمارا مقصود سرسید کی تعلیمی خدمات کا احاطہ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسی تعلیمی تحریک سے ایسے اذہان کی پرورش ہوئی اور ان میں شعور کی آبیاری اس طرح کی گئی کہ انھوں نے آگے چل کر تحریک آزادی میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس سے ہماری اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ سرسید ہی ہر تحریک کی بنیاد تھے۔ اگر اسی بات کو تھوڑا سا آگے بڑھائیں تو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر اپنا خطبہ دیتے ہوئے دو قومی نظریہ کی طرف توجہ دلائی تو اس کی کڑی بھی ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں کی جانب سے اُردو

کے مقابلے میں بھاشا زبان اور فارسی خط کے بدلے دیوناگری رسم الخط کے تناظر میں اُردو ہندی تنازعہ نے جنم لیا تو بنارس کے انگریز کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے ساتھ ان کی گفتگو کا مرکز مسلمانوں کی تعلیم تھا جسے سن کر شیکسپیئر بھی حیران تھا۔ سرسید کے الفاظ کچھ یوں تھے:

> "اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا، وہ دیکھے گا۔"(۸)

اس سے بڑھ کر انگریز کمشنر نے جب یہ کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ اس کے جواب میں سرسید نے کہا کہ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے نظریے کو بنیاد اسی پیشین گوئی نے فراہم کی اور پھر یہی دو قومی نظریہ جب ۱۹۴۷ء میں ایک تناور درخت بن کر دنیا کے نقشے پر اُبھرا تو سرسید کے یقین کو جِلا ملی۔ تحریک آزادی کا محاذ کوئی بھی ہو، سرسید ہر محاذ پر انگریزوں سے چومکھی لڑائی لڑنے میں مصروف عمل تھے۔ انھوں نے ہر محاذ پر بڑی ذہانت و فطانت کے بل بوتے پر کامیابی سمیٹی۔ ادبی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی۔ ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جِلد کے جواب میں "خطبات احمدیہ" (۱۸۷۰ء) ہو یا پھر مشنریوں کے مقابل "تبئیینُ الکلام" یعنی توریت و انجیل کی تفسیر یا پھر "رسالہ احکامِ طعامِ اہلِ کتاب"، سرسید نے وہ کام کیے کہ غیر بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔ اس کا جواب ہمیں لندن میں "خطبات احمدیہ" شائع ہونے پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز کے قلم سے کچھ اس طرح ملتا ہے:

> "عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انھیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوش نما چہرے پر لگاتے ہیں۔"(۹)

سرسید اپنی سوانح عمری کے حوالے سے کچھ اس قسم کی رائے رکھتے تھے:

> "میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے، اور رکھا ہی کیا ہے۔"(۱۰)

سرسید کی عاجزی اور سچا پن دیکھیے اور اتنا حقیقت پسند اعتراف شاید ہی کسی اس طرح کے بڑے آدمی کی زبان سے سنا ہو۔ ادبی، سیاسی، تعلیمی تحریکوں کے روح رواں کا اتنا عاجزانہ اِعتراف جہاں لوگ اپنے عیبوں کو بیان کرنے سے اِحتراز اور خوبیوں کو مبالغے کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں وہاں سرسید جیسا عظیم مصلح قوم سچ

بولنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتا۔ اس مصلح کا قوم کے لیے سوچنے کا اندازِ نظر کچھ یوں تھا، جب وہ انگلستان سے واپس علی گڑھ آئے تو روءسائے علی گڑھ کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے جو کلمات کہے وہ کچھ اس طرح تھے:

"ہاں یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو (دہلی سے مراد ہے) جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین پر پڑی ہیں، اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں، جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی، صرف مدرستہ العلوم کی محبت اور اپنی قوم کی بھلائی کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے، میں نے صرف اس خیال سے کہ کون سی راہ ہے جس سے قوم کی حالت دُرست ہو، دُور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔"(۱۱)

قوم کی محبت اور اس کی ترقی کے خواہاں سرسید کی لائف بھلے ہی اس کے لیے کچھ نہ ہو لیکن اس شخص نے جو کچھ قوم کی خاطر اور قوم کے لیے کیا سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

نتائج:

۱۔ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے آغاز کی ایک سے زائد وجوہات تھیں۔ ان میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، تعلیمی خاص طور پر اہم ہیں۔

۲۔ انگریزوں نے ہندوستان میں صرف مسلمانوں کو ٹارگٹ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رد عمل بھی صرف مسلمانوں کی طرف سے ہی آیا۔

۳۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا آغاز ڈم ڈم اور بارک پور سے جنوری ۱۸۵۷ء تا مارچ ۱۸۵۷ء میں ہوا جب فوج میں ہندوستانی سپاہیوں جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، سُور کی چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا، پھر آہستہ آہستہ یہ آگ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔

۴۔ ہزاروں فوجیوں کو ملازمت سے بے دخل کر دینے سے بھی فوج میں عدم تحفظ کا احساس ہوا۔

۵۔ عیسائی مشنریوں کا مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا سامنے آنا اور مراعات حاصل کرنا مذہبی تفاوت کو ظاہر کرتا تھا اس وجہ سے بھی مسلمانوں میں نفرت پیدا ہوئی۔

۶۔ فوج میں انگریز فوجیوں کی تنخواہ ہندوستانی فوجیوں کے مقابلے میں چار گنا تھی۔ بڑے عہدوں پر صرف انگریزوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔

۷۔ فوج میں انگریزوں کی طرف سے سُور اور گائے کی چربی والے کارتُوس کا استعمال بھی فوج میں انگریزوں کے خلاف نفرت اُبھارنے کا سبب بنا۔ جو مذہبی جذبات بھڑکانے کا سبب بنے۔

۸۔ اس تحریک کے اثرات مسلمانوں کی کسمپرسی، بدحالی اور معاشی ابتری کی صورت میں سامنے آئے۔

۹۔ مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے پاس نہ تعلیم تھی نہ تعلیمی ادارے۔ اس کی کمی علی گڑھ نے پوری کرنے کی کوشش کی۔

۱۰۔ مسلمانوں کا سماجی ڈھانچہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

مندرجہ بالا تمام عوامل کے ہوتے ہوئے ایک مردِ مجاہد ایسا بھی اٹھا کہ جس نے ہر ایک فورم پر تنِ تنہا مقابلہ کرتے ہوئے ایک طرح سے مسلمان قوم کو دو قومی نظریہ کی بنیاد فراہم کی۔

حوالہ جات

۱۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، (تین غیر مطبوعہ مضامین) تالیف و تدوین، سلیم الدین قریشی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشن، ۱۹۹۷ء، ص:۸

۲۔ ایضاً

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، لاہور: آئینہ ءادب، چوک مینار، انار کلی، ۱۹۶۶ء، ص:۱۲۲

۴۔ محمد مصطفی، عظیم تحریکِ آزادی، لاہور: نظریہ پاکستان ٹرسٹ، ۱۹۹۵ء، ص:۴۷

۵۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، لاہور: آئینہ ءادب، چوک مینار، انار کلی، ۱۹۶۶ء، ص:۱۲۲

۶۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، ص:۶۶

۷۔ ایضاً، ص:۴۱

۸۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید۔ ص:۴۳۱

۹۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، ص:۴۳۱

۱۰۔ سید عبداللہ، حیات جاوید پر ایک نظر، (مضمون) مشمولہ حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، لاہور: آئینہ ء ادب، چوک مینار، انار کلی، ۱۹۶۶ء، ص:۶

۱۱۔ صلاح الدین احمد، سر سید احمد خاں پر ایک نظر (مضمون) مشمولہ حیاتِ جاوید، مولانا الطاف حسین حالی، لاہور: آئینہ ءادب، چوک مینار، انار کلی، ۱۹۶۶ء، ص:۴۳